جماعت اسلامی ہند کی ترجیحات

ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

زیرِ نظر کتاب جماعت اسلامی ہند کے امیر ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری کے دو انٹرویوز اور ایک خطاب پر مشتمل ہے۔ جماعت کی نئی میقات اپریل ۲۰۰۳ء تا مارچ ۲۰۰۷ء کے لیے ڈاکٹر انصاری کا انتخاب جماعت کی مجلس نمائندگان (Representative Council) کی نشست میں ۵/اپریل ۲۰۰۳ء کو عمل میں آیا۔

پہلا انٹرویو جسے ''جماعت اسلامی ہند کو درپیش چیلنجز'' کا عنوان دیا گیا ہے۔ دعوت کے مدیر جناب پرواز رحمانی نے لیا تھا جو سہ روزہ ''دعوت'' دہلی کی ۱۹/اپریل کی اشاعت میں شائع ہوا۔

دوسرا انٹرویو جسے ''جماعت اسلامی کی ترجیحات'' کے زیرِ عنوان درج کیا گیا ہے ماہنامہ افکار ملی دہلی کے مئی ۲۰۰۳ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ یہ انٹرویو افکار ملی کے مدیر ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس نے لیا تھا۔

آخری حصہ جسے ''جماعت اسلامی کے اہداف'' کا عنوان دیا گیا ہے وہ خطاب ہے جو منصب امارت سنبھالنے کے بعد پہلی مرتبہ امیر جماعت نے مرکز جماعت کے کانفرنس ہال میں ایک بڑے مجمع کے سامنے کیا تھا۔ ان دونوں انٹرویوز اور خطاب کو محترم امیر جماعت کی نظرِ ثانی کے بعد کتابی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

امید ہے کہ کتاب ملک وملت کے موجودہ حالات میں جماعت اسلامی کے نقطہ نظر کو سمجھنے، اس کے پیشِ نظر کاموں، ترجیحات اور اہداف پر غور کرنے اور ان کے بارے میں اپنا موقف متعین کرنے میں مددگار اور رہنما ثابت ہوگی۔

ناشر

فہرست

پہلا انٹرویو:

جماعت اسلامی کو درپیش چیلنجز

سوال : آپ کے خیال میں وہ کون سے چیلنجز ہیں، جو اس وقت تحریک اسلامی کو درپیش ہیں؟

جواب: تحریک اسلامی سے آپ کی مراد غالباً عالمی تحریکِ اسلامی ہے۔ میرے نزدیک عالمی پس منظر میں تحریک اسلامی کا سب سے بڑا چیلنج اسلام کو بحیثیت مذہب زندگی کا واحد معقول نقطۂ نظر اور انسانی معاشرے کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے ایک اعلیٰ پروگرام کی حیثیت سے پیش کرنا ہے۔ گزشتہ صدی کے آخری حصے میں پوری دنیا میں مذہب کی طرف رجوع کا ایک عام رجحان ابھرا ہے۔ لامذہبیت وخدا بیزاری کی زندگی سے دنیا اکتائی ہوئی نظر آتی ہے۔ اسلامی تحریک کا فریضہ ہے کہ مذہب کو انسان کی سب سے بڑی ضرورت کے طور پر پیش کرے۔ مذہبی امور میں صحیح وغلط اور معقول ونامعقول میں تمیز کرنے کے اصولوں کی نشان دہی کرے، اس حقیقت کو نمایاں کرے کہ اسلام عام انسانی اور عقلی بنیادوں پر پورا اترتا ہے اور یہ کہ فرد اور انسانی معاشرے کی تعمیر کے لیے اسلام نے جو اصول دیے ہیں، انھیں پر زندگی کی صحیح معنوں میں تعمیر ہو سکتی ہے۔ یہی وہ نظام فکر وعمل اور یہی وہ دین ہے، جسے اس کائنات کے خالق ومالک نے انسانیت کی ابتدا سے انسانوں کی رہ نمائی کے لیے بھیجا ہے اور یہی وہ پیغام ہے جسے مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں اللہ کے پیغامبر لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہے ہیں اور آخری طور پر جسے حضرت محمد ﷺ نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ یہی وہ دین ہے جو صحیح معنوں میں محفوظ ہے۔ اس سے پہلے کے ادیان یکسر ترمیم وتحریف کا شکار ہو چکے ہیں۔ آج اگر کوئی اللہ کے صحیح دین کا متلاشی

ہوتو اس کے لیے اسلام کے سوا کوئی اور متبادل نہیں ہے۔ اسلام ہی انسان کے عقل وقلب کو سکون وراحت سے ہم کنار کرسکتا ہے۔ امت مسلمہ کا فرض منصبی ہے کہ وہ اسلام کو اس کی اصل شکل میں پیش کرے۔ دنیا کو اس کے آفاقی مشن سے پوری طرح روشناس کرائے۔ اس کام کی انجام دہی میں ان مسائل اور امور کو ترجیحی طور پر پیش نظر رکھے، جنھیں گزشتہ چالیس سالوں میں مغربی مصنفین نے اپنی تحریروں میں اٹھایا ہے۔ خاص طور پر وہ مسائل جن کا تعلق اسلامی سیاست، خواتین اور اقلیتوں کے مقام وحقوق سے ہے۔ ان مسائل پر غور وفکر کی ابتدا موجودہ فقہی لٹریچر کے بجائے براہ راست قرآن مجید کے اصولی بیانات اور حدیث کی تشریحات سے ہونی چاہیے۔ عالمی تحریک اسلامی کے سامنے آج سب سے بڑا چیلنج یہی ہے۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس سے قبل علماء وفقہا نے جو تفریعات کی ہیں، وہ قرآن وسنت سے ماخوذ نہیں ہیں۔ لیکن اگر یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان کا علم اور سوچنے اور سمجھنے کا ڈھنگ اپنے دور کے حالات وتغیرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تو خدائی ہدایت کے فہم اور اس سے استدلال واستنباط بھی اس کلیہ سے آزاد نہیں ہوسکتے۔ اس لیے لازم ہے کہ امت آج بدلتے ہوئے حالات کا چیلنج قبول کرتے ہوئے سب سے پہلے کتاب وسنت کی طرف رجوع کرے۔

سوال: جماعت اسلامی ہند کا دائرۂ کار اگرچہ انڈین یونین ہے، تاہم اسلام کے آفاقی نظریۂ حیات کی حامل ہونے کے ناطے عالم اسلام کے ساتھ اس کے روابط کی نوعیت کیا ہوگی؟

جواب: جماعت اسلامی ہند کا اصل دائرۂ کار اگرچہ ہندستان ہے لیکن ایک آفاقی نظریہ کی حامل ہونے کی حیثیت سے جماعت اسلامی اپنی دعوت کو عالم گیر سطح پر پیش کرنے میں عالم اسلامی کی دوسری تحریکوں کے ساتھ تعاون کرے گی اور اس بات کی بھی کوشش کرے گی کہ مختلف اسلامی تحریکوں سے ربط وتعلق استوار ہو، مشترکہ مسائل میں متفقہ موقف اختیار کیا جائے۔ عراق پر ظالمانہ امریکی وبرطانوی جارحیت نے مسلم ملکوں میں اسلامی یگانگت کے جذبے کو جس طرح ابھارا ہے وہ قائم رہے اور تقویت پائے اور امّت میں یہ احساس بیدار ہو کہ آج مسلم ممالک

معاشرتی، معاشی اور سیاسی میدانوں میں جن وجوہ سے دنیا کے دیگر ملکوں سے پیچھے ہیں بلکہ ان کے محتاج اور غلام بن کر رہ گئے ہیں، ان کا ازالہ ہو۔ عراق کے المیے کی وجہ سے اسلامی ممالک کے حکمراں طبقے کی بے بسی اور کس مپرسی کا جو مظاہرہ ہوا ہے، کوشش ہونی چاہیے کہ ہمارے حکمراں اپنے حقیر ذاتی، خاندانی اور پارٹی مفادات سے بلند ہو کر اپنے اپنے ملکوں میں صحیح اسلامی خطوط پر جمہوری نظام قائم کریں اور اسلامی معیشت کے اصولوں پر اپنی معیشت تشکیل دیں۔ اپنے اور اپنے عوام کے درمیان غیر انسانی اور غیر اسلامی بعد کو دور کریں اور بنیان مرصوص بن کر ایک نئی صبح کا آغاز کریں۔

سوال: آپ کے نزدیک اندرون ملک وہ کون سے مسائل ہیں، جو ملّت اسلامیہ کو بالعموم اور تحریک اسلامی کو بالخصوص درپیش ہیں؟

جواب: آج ملّت اسلامیہ ہند کو جو سب سے بڑا چیلنج درپیش ہے، وہ ہندو جارحانہ قوم پرستی کا چیلنج ہے، جسے مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے اور جس کی مختلف تعبیریں کی جاتی ہیں۔ مسلم ملّت کو بالعموم اور تحریک اسلامی کو بالخصوص اس بات کی کوشش کرنی ہے کہ ہندستان کی تعمیر و ترقی کا وہ نقشہ جو ہندستانی دستور کے مرتبین کے پیش نظر رہا، اس میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔ ہندستانی ریاست کا سیکولر کیریکٹر برقرار رہے، یعنی ریاست مذاہب کے معاملے میں بالکل غیر جانبدار رہے۔ نہ کسی مذہب کی طرفداری کرے اور نہ کسی مذہب کے ماننے والوں کے ساتھ امتیازی سلوک برتے۔ اسی طرح یہ کوشش بھی ہونی چاہیے کہ ریاست کا جمہوری ڈھانچا قائم رہے۔ حکومت، سیاسی پارٹیاں اور عوام جمہوری حدود میں رہ کر ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لیں۔ ہندستان مختلف مذاہب اور مختلف قوموں کا ایک صحت مند گہوارہ ہے۔ یہاں ہر شہری کو بلا تفریق مذہب و ملّت یکساں حقوق حاصل ہونے چاہییں۔ ہندستانی قومیت اور ہندستانی تہذیب مختلف مذاہب کا ایک حسین مجموعہ ہے۔ یہی صورت حال باقی رہنی چاہیے۔

جماعت اسلامی کے نزدیک سارے انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ معاشرتی اور

سیاسی اعتبار سے سب برابر اور عزّت واحترام کے مستحق ہیں۔ جماعت کی کوشش ہوگی کہ ہندستان میں اونچ نیچ، عدم مساوات، نفرت وجارحیت کا جو ماحول بن رہا ہے وہ ختم ہو۔ عدل وانصاف قائم ہو۔ معاشرتی ظلم اور معاشی استحصال کا خاتمہ ہو۔ ایسے ہندستان کو پروان چڑھانے کے لیے مختلف گوشوں سے جو آوازیں اٹھ رہی ہیں اور جو کوششیں ہورہی ہیں جماعت اسلامی ان میں شریک ہوگی اور اپنی حد تک ممکنہ کوشش کرے گی۔

جماعت اسلامی یہ بھی کوشش کرے گی کہ جارحانہ ہندتو کے زیر اثر مسلمانوں میں بے بسی اور پست ہمتی پیدا کرنے اور مختلف طریقوں سے انھیں دین سے بے زار کرنے کی جو کوششیں ہورہی ہیں، وہ کامیاب نہ ہوں۔ اُن میں ملّی عظمت کا احساس بیدار ہو اور وہ اپنے دینی اداروں اور تعلیمی مراکز کے تحفظ کے لیے کوشاں ہوں۔ ان اہداف کے حصول کے لیے جماعت مختلف جماعتوں، شخصیات اور اداروں کے ساتھ مل جل کر بھی کام کرے گی اور جہاں ممکن ہوگا خود بھی پیش قدمی کرے گی۔

جماعت اسلامی اس بات کی بھی کوشش کرے گی کہ ہندستان کے مسلمانوں کو ان کا اصلی منصب ومقام یاد دلائے۔ وہ دین کے صحیح نمایندے بن کر اٹھیں اور لوگوں کے سامنے اسلام کا عملی نمونہ پیش کریں۔ ساتھ ہی ملّت میں ایک بڑا گروہ ایسے افراد کا تیار ہو جو دعوتی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لے اور برادران وطن کو اسلام کی دولت سے روشناس کرائے۔''

سوال: اتحادِ ملّت جماعت اسلامی ہند کو ہمیشہ مطلوب رہا ہے۔ گزشتہ تجربات کی روشنی میں اس سلسلے میں آپ کا طریق کار کیا ہوگا؟

جواب: اتحادِ ملّت کا جو مظاہرہ بابری مسجد کے قضیے کے سلسلہ میں گزشتہ دنوں مسلم پرسنل لا بورڈ کے پلیٹ فارم سے ہوا ہے، اس میں مسلمانوں کی دوسری تنظیموں کے ساتھ ساتھ جماعت اسلامی بھی شریک اور پیش پیش رہی ہے۔ یہ تجربہ بڑا خوش آیند اور کارگر ثابت ہوا ہے۔ جماعت اسلامی

اس طریق کار کو ملّت کے دوسرے مسائل کے حل میں بھی اختیار کرنے اور پروان چڑھانے کی کوشش کرے گی۔

جماعت اسلامی کی بھرپور کوشش ہوگی کہ مشترک مسائل میں ملّت جماعتی و مسلکی اختلافات سے بلند ہوکر متفقہ موقف اختیار کرے اور اس کے حصول کے لیے متفقہ طور پر اقدام کرے اور اس سلسلے میں ہر وہ پلیٹ فارم اختیار کرے جو اس کے لیے مناسب و مفید ہو۔

سوال: اس مقصد کے لیے مسلم مجلس مشاورت آپ کے خیال میں کیا رول ادا کرسکتی ہے؟

جواب: مسلم مجلس مشاورت مسلم جماعتوں کے ایک وفاق کے طور پر سامنے آئی تھی۔ اس کے سامنے مسلمانوں کے سیاسی اور سماجی مفادات کا تحفظ تھا۔ شروع میں مجلس اپنا یہ رول بڑی حد تک ادا کرتی رہی۔ اب بعض وجوہ سے اس رول میں کسی حد تک کمی آگئی ہے۔ اگرچہ اب بھی اس کے ذمے دار سیاسی اور سماجی مسائل میں ملّت کی فکری رہ نمائی کررہے ہیں، مگر جہاں تک عملی میدان میں رہ نمائی کا تعلق ہے، بعض دشواریوں کی وجہ سے اس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو پارہی ہے۔ جماعت اسلامی چاہے گی کہ یہ دشواریاں ختم ہوں اور مجلس اس میدان میں بھی ایک فعّال کردار ادا کرے۔ جماعت کی یہ بھی کوشش ہوگی کہ مسلمانوں کی دوسری تنظیمیں، جماعتیں اور نمایندہ شخصیات بھی اس کام میں تعاون کریں۔

سوال: آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام بنیادی طور پر عائلی قوانین شریعت کے تحفظ کی خاطر عمل میں آیا تھا، مگر اب اس نے دوسرے امور و مسائل کو بھی اپنے دائرۂ کار میں شامل کرلیا ہے۔ آپ کے خیال میں یہ کہاں تک درست ہے؟

جواب: گزشتہ دنوں بابری مسجد کے قضیے کے سلسلہ میں مسلم پرسنل لا بورڈ نے ملّت کے لیے ایک مشترکہ پلیٹ فارم کا رول ادا کیا۔ اگرچہ اس طرح کا کام مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کے مقاصد میں شامل نہیں ہے لیکن یہ بھی ملّت کی ایک ضرورت تھی، جس کے لیے مسلم پرسنل لا بورڈ کا پلیٹ فارم

استعمال کیا گیا۔ مناسب ہے کہ جب تک بابری مسجد کا قضیہ موجود ہے، اس وقت تک اسی پلیٹ فارم کو استعمال کیا جائے۔ البتہ آیندہ بہتر ہوگا کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کی دلچسپیاں اور سرگرمیاں انھی مسائل تک محدود ہوں، جو اس کی تاسیس وقیام میں پیش نظر رہے ہیں۔ مثلاً ملک کے مختلف حصوں میں شرعی پنچایتوں کا قیام۔ اس ضمن میں جماعت اسلامی اُس کوشش کا خیر مقدم کرتی ہے، جو قاضی مجاہد الاسلام مرحوم (اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے) کی رہ نمائی میں مسلم پرسنل لا کی تدوین (Codification) کی شکل میں سامنے آئی۔ اس سلسلے میں جماعت اسلامی یہ بھی چاہے گی کہ موجودہ دور میں عائلی قوانین کے سلسلے کے کچھ ایسے مسائل جو مسلمان مردوں اور خواتین کو پیش آرہے ہیں مسلم پرسنل لا بورڈ اس کا بھی نوٹس لے اور ملک وملّت کی رہ نمائی کرے۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی گزارش کرے گی کہ بورڈ اس کام میں اپنے کوصرف حنفی فقہ کی حدود میں محدود نہ کرے۔

سوال: پارلیمانی سیاست (حق رائے دہی کے استعمال) کے سلسلے میں کیا جماعت اسلامی ہند یک سو ہو چکی ہے؟

جواب: جی ہاں! جماعت اسلامی اسمبلیوں اور پارلیمنٹ کے انتخاب پر اثر انداز ہونے اور ایسے نمایندوں اور ایسی قوتوں کو کامیاب کرنے کے معاملے میں یکسو ہے، جو ملک میں جمہوری قدروں کے تحفظ، سیاسی امور میں اخلاقی قدروں کی پاسداری، اور بلالحاظ مذہب وملّت انسانی حقوق کی حفاظت اور عدل وانصاف کے قیام کے خواہاں ہیں۔ اگرچہ اس ضمن میں بعض تفصیلات زیر بحث رہی ہیں اور بعض کے سلسلے میں جماعت کے کچھ افراد کے تحفظات (Reservations) بھی رہے ہیں، لیکن ان کے یہ تحفظات خدا کا شکر ہے اپنی حدود میں ہیں۔ ان کی وجہ سے جماعت کو کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہے۔

سوال: میقات رواں میں مجلس نمایندگان اور مرکزی مجلسِ شوریٰ میں نسبتاً نوجوان ارکان خاصی تعداد میں آئے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟

جواب: میں ذاتی طور پر اسے خوش آیند تصوّر کرتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ ہمارا نوجوان طبقہ نئے عزم وحوصلہ، نئے جذبہ اور نئی توانائیوں کے ساتھ جماعت کے پیش نظر مختلف کاموں اور میدانوں میں اپنا بھرپور تعاون پیش کرے گا اور تحریک کو چلانے اور کامیاب کرنے میں فعال کردار ادا کرے گا۔

سوال: اگر مجلس نمایندگان کو معیار بنایا جائے تو جماعتی فورموں میں خواتین کی نمایندگی بہت ہی کم نظر آتی ہے۔ایسا کیوں ہے؟

جواب: جماعت میں خواتین کی شرکت مردوں کے مقابلے میں ابتدا ہی سے کم رہی ہے۔ گزشتہ میقات میں یہ رجحان بدلا ہے۔ جماعت کے اندر اور جماعت کی ذیلی تنظیم جی آئی او (گرلس اسلامک آرگنائزیشن) دونوں میں خواتین میں کام آگے بڑھا ہے۔ ان شاء اللہ آیندہ ہماری کوشش ہوگی کہ اس میقات میں اس رجحان میں اضافہ ہو۔ جماعت اور طالبات کی ذیلی تنظیم دونوں میں خواتین بڑی تعداد میں شامل ہوں اور حسب موقع جماعت کی اعلیٰ مجالس میں بھی ان کی نمایندگی میں اضافہ ہو اور وہ موثر رول ادا کریں۔

سوال: بدلتے ہوئے ملکی اور عالمی حالات میں جماعت اسلامی ہند کی ترجیحات (بحیثیت مجموعی) کیا ہوں گی؟

جواب: عالمی اور خاص طور پر عالم اسلام کے تناظر میں جماعت اسلامی کو کیا کرنا چاہیے، اس پر گفتگو پہلے ہو چکی ہے اور ملکی تناظر میں بھی جماعت اسلامی کے پیش نظر کاموں کا ذکر آچکا ہے۔ ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ بہت سے دوسرے کام ہیں جن کی طرف جماعت اسلامی کو خصوصی توجہ کرنی چاہیے۔ ان میں سرفہرست مذہبی بنیادوں پر انسانوں کے اندر امتیاز، اونچ نیچ، ذات برادری کی تقسیم کا مسئلہ خاص طور پر دلت اور پسماندہ اقوام وقبائل کے انسانی حقوق کا تحفظ، ان کے ساتھ انسانی سلوک، اخوت ومساوات، اور معاشرے میں ان کے لیے عزت وشرف کے

حصول کی جدو جہد ہے۔ اسی طرح یہاں بچوں اور عورتوں کا جو مختلف طریقوں سے استحصال ہورہا ہے، اس کے ازالے کی کوششوں میں اپنے طور پر بھی اور دوسروں کے ساتھ مل کر بھی اقدام کرنے کی ضرورت ہے۔

اس ضمن میں جماعت اسلامی کی یہ بھی کوشش ہوگی کہ اسلام کے وحدت انسانی، اخوت اور مودت ومحبت کا تصور عام ہو اور اسلام کے معاشی اصول ملک کی معاشی تعمیر میں پیش نظر ہوں۔

اس سلسلے میں آخری اور اہم بات جس کی طرف ہمیں توجہ کرنی ہوگی وہ یہ ہے کہ مختلف کام جن کی اس گفتگو میں نشاندہی کی گئی ہے، ان کو صحیح اور موثر انداز میں انجام دینے کے لیے جماعت اسلامی کو جس طرح کے افراد درکار ہیں انھیں تیار کرنے کی منصوبہ بند کوشش ہو۔ اسی طرح ان سارے کاموں کو جن کا ذکر آیا ہے موثر طور پر انجام دینے کے لیے جماعت کا تنظیمی ڈھانچا مرکز سے لے کر مقامی سطح تک موثر بنایا جائے۔

دوسرا انٹرویو:

جماعت اسلامی کی ترجیحات

سوال: گزشتہ پچاس پچپن سالوں کے تجربات کی روشنی میں آیندہ جماعت اسلامی کی ترجیحات کیا ہوں گی؟

جواب: جماعت اسلامی، اسلام کو ایک جامع دین اور کامل نظام حیات کی حیثیت سے پیش کرتی رہی ہے۔ جماعت یہ کام بہتر طریقے سے انجام دے گی اور برادران ملک کے سامنے اسلام کا تعارف اچھی سطح سے کرانا چاہے گی۔ اچھی سطح سے میری مراد یہ ہے کہ اس ملک کے پڑھے لکھے طبقے کے سامنے یہ سوال آئے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے۔ صحیح اور غلط مذہب میں تمیز کے اصول کیا ہو سکتے ہیں۔ زندگی کی تعمیر میں مذہب کو کیا رول ادا کرنا چاہیے۔ دراصل یہ سوالات مذہب کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے سے متعلّق بہت اہم ہیں۔ اس لیے جماعت چاہے گی کہ یہ سوالات ملک کے سوچنے اور سمجھنے والے لوگوں کے سامنے آئیں تاکہ وہ اسلام کو اس سوال کے ایک جواب کی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش کرسکیں۔ بغیر کسی تعصب کے دوسرے مذاہب سے تقابل کر کے دیکھیں کہ اسلام اس معیار پر کس طرح پورا اترتا ہے۔

اس ضمن میں ہم اس بات کی کوشش کریں گے کہ ہندستان کے مختلف مذاہب کا مطالعہ کیا جائے اور اسلامی نقطۂ نظر سے ان پر سنجیدہ گفتگو کی جائے۔ مگر کسی کے جذبات کو مجروح کیے بغیر اور کسی کے احساس کو چوٹ پہنچائے بغیر۔ مذہب زندگی کا انتہائی اہم عنصر ہے۔ انسان صرف ایک سماجی حیوان نہیں ہے اور نہ وہ صرف ایک مادی یا اخلاقی وجود ہے۔ وہ ایک مذہبی وجود بھی ہے۔

ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس وجود کو سنجیدگی سے لیا جائے۔ آج کی مادہ پرستانہ زندگی اور اس کی مصروفیات میں لوگ اس حقیقت کو بھولے جا رہے ہیں۔ انھیں اسے بھولنا نہیں چاہیے۔ یہ ہماری زندگی کا انتہائی اہم مسئلہ ہے۔ جماعت، اسلام کو اس مسئلے کا حل بتاتی ہے اور چاہتی ہے کہ ہندوستان کا پڑھا لکھا طبقہ اسلام پر اس حیثیت سے غور کرے۔

جماعت یہ بھی کہتی ہے کہ اسلام کا دعویٰ ہے کہ یہی وہ دین ہے، جو ابتدائے آفرینش سے کائنات کے خالق و مالک نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ بھیجا ہے۔ دنیا کے ہر حلقہ میں اللہ کے رسول آئے ہیں۔ سب نے ایک ہی دین پیش کیا ہے۔ ان کی تعلیمات میں بنیادی باتیں ایک ہی رہی ہیں۔ صرف تفصیلی ضوابط میں حالات وظروف میں تبدیلی کی وجہ سے کچھ اختلاف رہا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ہندوستان میں بھی انبیاء آئے ہوں، لیکن ہندوستان کی مذہبی تاریخ جس ڈھنگ سے پیش کی جاتی ہے اور بلند ترین شخصیات کی جو تصویریں سامنے آتی ہیں ان کی روشنی میں ان افراد کا تعین بہت مشکل ہے۔ حق کے متلاشی حضرات کو خدا کے دین کے لیے ہندوستانی روایتی مذاہب سے باہر نظر دوڑانی چاہیے۔ اگر انھیں یہ یقین ہے کہ کائنات کا خالق تخلیق کے بعد دنیا سے بے تعلق نہیں ہو گیا اور انسان کو حقیقت کی تلاش میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ نہیں دیا ہے۔ اور اگر یہ بھی یقین ہے کہ اس مہم میں رہ نمائی کے لیے انسانی عقل کافی نہیں ہے اور نہ صرف عقل بلکہ وہ کشف وشہود اور تجلیات وروحانی تجربات بھی قابل اعتماد نہیں جو سادھوؤں، سنتوں، رشیوں اور منیوں کو حاصل ہوتے رہے ہیں کیوں کہ ان بزرگوں کے مشاہدات اور ان کی تعبیروں میں بنیادی اختلافات ہیں جن کی بنا پر انھیں خدا کی ہدایت قرار دینا اور ان کی تعلیمات کو خدا کا دین کہنا صحیح نہیں ہو سکتا۔ اگر ان تمام باتوں پر یقین ہو تو حق کے جویا حضرات کے لیے اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں کہ وہ ہندوستانی روایتی مذاہب سے باہر نظر دوڑائیں۔ اسی پس منظر میں ہم اپنے اہل ملک کو اسلام کے مطالعے کی دعوت دیتے ہیں۔

سوال: کیا اس سلسلے میں ہندوستانی مسلمانوں کا بھی کوئی رول ہے؟

جواب: مسلمانوں کے اندر سے ایک گروہ ایسا تیار ہونا چاہیے جو علمی وفکری میدان میں اسلام

کی صحیح نمایندگی ہندوستانی بھائیوں کے سامنے کر سکے۔ اس گروہ میں ایسے دانشور ہونے چاہئیں جو اسلام کے ساتھ ہندوستانی کلچر، مذہب، تہذیب اور ثقافت پر گہری نظر رکھتے ہوں۔ تاکہ اسلام کے پیغام کو اہل ملک کے سامنے صحیح معنی میں پیش کر سکیں۔ ایسے افراد جو نہ صرف عقل وفکر کی اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہوں، ان کے دلوں میں اسلامی دعوت کو عام کرنے کی شدید تڑپ اور ایثار وقربانی کا غیر معمولی جذبہ بھی ہو، جو اس راہ کی مشکلات سے بخوبی واقف ہوں اور ان کے مقابلے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

دوسری چیز ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں ہر شہری کو مذہب کے معاملے میں پوری آزادی حاصل رہے۔ نہ صرف دستوری اور قانونی طور پر بلکہ سماجی فضا بھی ایسی ہو کہ ہر شخص جمہوری وآئینی حدود میں رہتے ہوئے اپنا مذہب دوسروں کے سامنے پیش کر سکے اور اس پر غور وفکر کر کے قبول کرنے کی دعوت دے۔ ہر شخص کو یہ آزادی حاصل رہے کہ وہ جس مذہب کو پسند کرے اسے اختیار کر لے۔ اس معاملے میں نہ کوئی رکاوٹ ہو اور نہ کوئی طاقت مانع ہو۔ جو قوانین اور ضابطے ریاستوں کی سطح پر تبدیلی مذہب کے خلاف بن رہے ہیں، وہ جمہوریت مخالف اور حقوق انسانی کی خلاف ورزی کے مترادف ہیں۔ ان قوانین کے خلاف کئی ممتاز شخصیتوں، اداروں اور حقوق انسانی کے تحفظ کی تنظیموں نے آوازیں اٹھائی ہیں۔ ملک کے اندر اور ملک سے باہر مختلف عیسائی تنظیموں اور اداروں نے ان قوانین کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ مسلمانوں کے دینی رہ نماؤں کو بھی اس احتجاج میں شریک ہونا چاہیے اور ان قوانین کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے۔

سوال: غیر مسلموں میں دعوتی کام کرتے وقت یہ بات جماعت کے پیش نظر رہی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں سے متعلق جو غلط فہمیاں غیر مسلموں میں پائی جاتی ہیں، ان کا ازالہ ہو سکے۔ لیکن ایسا لگ رہا ہے کہ غلط فہمیاں کم ہونے کی بجائے بڑھتی جا رہی ہیں۔ مسلمانوں سے نفرت اور بغض وعناد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ آپ کے خیال میں اس صورت حال کا تدارک کیسے ممکن ہے؟

جواب: نفرت کے ماحول کو بدلنے کے لیے مختلف سطحوں پر کوششوں کی ضرورت ہے۔ایک سطح سماجی ہے۔ضرورت ہے کہ سماج کے ممتاز افراد، ادارے اور تنظیمیں سرکاری ہوں یا نیم سرکاری یا آزاداس مقصد کے لیے سرگرم عمل ہو جائیں۔مختلف مذاہب میں ایسے بے شمار لوگ، افراد اور ادارے موجود ہیں، جو چاہتے ہیں کہ نفرت کا ماحول ختم ہو، باہمی احترام، افہام وتفہیم، ڈائیلاگ، ہمدردی اور محبت کی فضا قائم ہو۔ایسے غیر مذہبی لوگ بھی کثرت سے ہیں، جو یہی خواہش رکھتے ہیں۔ہندوستانی عوام کی اکثریت بھی اس کی متمنی ہے اگر چہ زبان سے اس کا اظہار بہت کم کر پاتی ہے، تاہم جب موقع ملتا ہے بول اٹھتی ہے۔ضرورت ہے کہ ایسے تمام لوگوں کو جمع کیا جائے، مل جل کر نفرت کے ماحول کو ختم کیا جائے اور افہام وتفہیم، ہمدردی اور محبت کی فضا پروان چڑھائی جائے۔

دوسری سطح قانونی ہے۔ایسے لوگ جو فرقوں، مذہبوں اور قوموں کی بنیاد پر ہندوستان کو تقسیم کرتے ہیں، ان کے اندر عناد و دشمنی، نفرت اور بغض پیدا کرنے کے لیے سرگرم رہتے ہیں، جہاں موقع ملتا ہے فرقہ وارانہ فسادات، خون ریزی اور لوٹ مار کرنے اور کرانے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کرنی چاہیے۔اس کام میں تمام مسلم اور غیر مسلم، مذہبی اور غیر مذہبی افراد، اداروں اور تنظیموں کو مل جل کر اقدام کرنا چاہیے۔

نفرت کے ماحول کو بدلنے کے لیے تیسری سطح کو ہم سیاسی سطح قرار دے سکتے ہیں۔ملک میں مختلف سیاسی جماعتیں ہیں، جو مذہب اور کلچر کی بنیاد پر ہندوستانیوں کی تقسیم اور ان میں بغض وعناد اور نفرت وعداوت کی فضا پروان چڑھانے کی مخالف ہیں، یہ جماعتیں اور مختلف ودھان سبھاؤں اور لوک سبھا میں ان کے نمایندے جن میں اقلیتوں کے افراد، مسلم، عیسائی اور سکھ سبھی شامل ہیں، سیاسی سطح پر بغض وعداوت کے خلاف آواز اٹھا سکتے ہیں اور حکومت پر دباؤ ڈال کر نفرت وحقارت کے مبلغین کے خلاف اقدام کرنے کے لیے اُسے مجبور کر سکتے ہیں۔

سوال: ملکی سطح پر ہندو فرقہ پرست طاقتوں نے ملکی ایجنڈے کو ہائی جیک کر لیا ہے اور استعماری اور صیہونی طاقتیں عالمی سطح پر اپنا ایجنڈا دوسروں پر تھوپ رہی ہیں۔دونوں ہی سطحوں پر مسلمانوں کا

رول دفاعی اور ردِّ عمل (reactionary) کا ہو کر رہ گیا ہے۔ اس صورت حال کو تبدیل کرنے کے لیے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟

جواب: اس ملک کی تعمیر ابتداءً جن اصولوں پر ہوئی تھی اور جو اس ملک کے دستور میں درج ہیں اور جن پر عرصہ دراز تک ملک کو چلانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے، بعض طاقتیں عوام کو ان کے خلاف ابھار رہی ہیں۔ ہمیں آگے بڑھ کر ملک کے بنیادی کردار (Basic Character) کو تبدیل ہونے سے روکنا چاہیے۔ اس ملک کا بنیادی ڈھانچا یہ ہے کہ یہ ایک جمہوری نظام ہے۔ ہر فرد جو اس کا شہری ہے، اُسے یکساں حقوق حاصل ہیں، خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہب، علاقے یا ریاست سے ہو، یا کوئی بھی زبان بولنے والا ہو۔ وہ یکساں طور پر محترم ہے۔ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ یہ ملک مختلف تہذیبوں، مختلف کلچر اور مختلف مذاہب کے ماننے والوں پر مشتمل ہے۔ اس کا کلچر وحدانی نہیں کثیر عنصری (Pluralistic) ہے۔ وہ سارے لوگ جو یہاں آئے اور رہ گئے خواہ آریہ نسل کے ہوں خواہ مسلمان یا عیسائی، یہ سب کا ملک ہے۔ سب نے یہاں کی تہذیب و ثقافت کی تعمیر میں حصہ لیا ہے۔ یہ اصول تسلیم کیا جانا چاہیے۔ اس بنیاد پر یہاں کا جمہوری نظام قائم ہے۔ اس کی دوسری بنیاد یہ ہے کہ مذہب کی بنیاد پر کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔ سب کا برابر اور یکساں احترام کیا جائے گا۔ دستوری زبان میں اسے سیکولرزم کہا جاتا ہے۔ یہ دونوں اصول بعض حلقوں کی طرف سے آج چیلنج کیے جا رہے ہیں۔ بعض حضرات ان چیلنجز کی تاویل کرتے ہیں۔ میری گزارش ہے کہ ان تاویلوں سے کنارہ کشی کرتے ہوئے حقیقت کا سامنا کیا جائے۔ ایسی قوتیں جو اس ملک کے بنیادی کیریکٹر کو تبدیل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، انھیں سماجی، قانونی اور حکومتی سطح پر روکا جائے۔ اس سلسلہ میں مرکز اور ریاستی حکومتوں پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ سیاسی جماعتوں اور مختلف مذہبی رہ نماؤں کی ذمے داری بھی اس سلسلے میں کچھ کم نہیں ہے۔

سوال: عالمی سطح پر امریکی اور صیہونی طاقتیں برابر اپنے ایجنڈے کو بروئے کار لا رہی ہیں۔

مسلمان تحفظ اور دفاع کے حصار میں محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایک عجیب بے بسی کی سی کیفیت ہے۔اس کے تدارک کے لیے کیا کیا جانا چاہیے؟

جواب: پہلی بات جو اس سلسلے میں کرنی چاہیے وہ یہ ہے کہ امریکہ برطانیہ اور آسٹریلیا کی طرف سے جو کچھ ماضی قریب میں ہوا ہے، خاص طور سے عراق سے متعلّق، اس کے پیچھے جو بنیادی مقاصد ہیں انھیں بے نقاب کیا جائے۔ امریکہ و برطانیہ نے یہ پوزیشن لی تھی کہ عراق میں عمومی تباہی کے ہتھیار ہیں۔ خاص طور پر کیمیاوی اور حیاتیاتی اور وہ دنیا کے لیے خطرہ ہیں۔ چوں کہ وہ موجود ہیں اور عراق تمام دباؤ کے باوجود ان کو تباہ کرنے میں ناکام رہا ہے، اس لیے ہمیں حق پہنچتا ہے کہ اس خطرے سے دنیا کو اور اپنے ملکوں کو بچانے کے لیے اس پر حملہ کر دیں۔ اس کے لیے انکوائری کمیشن قائم ہوا اور اس نے تفصیلی تحقیقات کیں اور یہ بتایا کہ عراق میں عمومی تباہی کے ہتھیاروں کی موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ لیکن ان طاقتوں نے اس انکوائری کے نتائج کا انتظار کیے بغیر مہینوں پہلے علاقے میں اپنی فوجیں بھیجنی شروع کر دیں۔ اس سے ہر آدمی آسانی سے سمجھ سکتا تھا کہ جواز ہو یا نہ ہو حملہ تو انھیں کرنا تھا۔ جب پہلے عامل پر انھیں کامیابی نہیں ملی تو دوسری وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ صدام کی حکومت ظالمانہ اور جابرانہ ہے۔ اس نے عوام پر مظالم کے پہاڑ ڈھائے ہیں۔ صدام حسین سے ہم عراقی عوام کو نجات دلانا چاہتے ہیں۔ یہ بڑا اچھا ''اخلاقی'' بہانا تھا۔ لیکن حقیقت اس کے پیچھے کچھ اور تھی۔ اس کے پس پشت دو اسباب کارفرما تھے۔ عراق کے تیل کے ذخائر پر قبضہ کرنا اور اپنے اقتصادی حالات کو بہتر بنانا۔ لیکن اس کے آگے بھی ایک بات تھی جسے نمبر اوّل پر رکھنا چاہیے، وہ اسرائیلی منصوبہ کی توسیع تھی۔ اسرائیل عظیم اسرائیل کا خواب دیکھتا ہے، امریکہ و برطانیہ کو دکھاتا ہے اور ان کو استعمال کر کے اپنے خواب کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ یہ تکلیف دہ مقاصد ہیں اور ان لوگوں کی طرف سے آ رہے ہیں جو انسانی آزادی اور انسانی حقوق کے علمبردار کہلاتے ہیں، لیکن دنیا جانتی ہے کہ امریکہ کی پانچ سو سالہ تاریخ میں یہ باب جو اَب لکھا جا رہا ہے کوئی نیا باب نہیں ہے۔ مختلف ملکوں کے ساتھ یہی کچھ وہ ماضی میں کرتا رہا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جس انتہائی ڈھٹائی اور بے حیائی کے ساتھ آج کیا جا رہا ہے، اس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔

سوال: اس کے تدارک کے لیے عالم اسلام کو کیا کرنا چاہیے؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر ملک کو اپنا گھر درست کرنا چاہیے۔ مسلم ملکوں میں حکمراں طبقہ اور عوام میں بُعد ہے۔ ایک خلیج حائل ہے۔ ایک دوسرے کے خلاف جذبات موجود ہیں۔ اظہار رائے کی آزادی نہیں ہے۔ حکمرانوں کو عوامی نمایندہ بن کر کام کرنے کا کوئی شعور نہیں ہے۔ جمہوریت نہیں ہے، نہ جمہوری اداروں کو قائم کرنے کی سنجیدہ اور مخلصانہ کوئی کوشش ہے۔ جہاں جمہوریت کا نام لیا جاتا ہے، وہ بھی بس کھیل اور تماشا ہے۔ شوریٰ قائم کی جاتی ہے، لیکن وہ بس ایک دکھاوا ہوتا ہے۔ اب ان حکمرانوں کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ یا تو خود تباہ ہو جائیں اور قوم کو تباہ کر دیں یا پھر اقتدار اپنے عوام کے سپرد کر دیں اور عوام کے نمایندے کے طور پر کام کریں۔ وہ چاہیں تو برطانوی طرز پر اپنے لیے بھی کچھ سہولتیں حاصل کر سکتے ہیں۔ اس طرح کا تجربہ ان مسلم ملکوں میں کیا جا سکتا ہے، جہاں بادشاہتیں موجود ہیں۔ دوسرا کام یہ کرنا چاہیے کہ معاشی وسائل کو دوسروں کے سپرد نہ کیا جائے۔ نہ اپنے دفاع کو دوسروں کے حوالے کیا جائے۔ خارجی قوتوں کو دھیرے دھیرے اپنے ملکوں سے نکال دیا جائے۔ یہ کام ہر ریاست کے لیے علاحدہ علاحدہ کرنا مشکل ہوگا۔ تمام مسلم ملکوں کو مل کر اس کام کو انجام دینا چاہیے۔ تنظیم اسلامی کانفرنس جو اس وقت ایک عضو معطّل بن کر رہ گئی ہے، اسے موثر بنانا چاہیے۔ عالمی استعمار اور صیہونی خطرے سے بچنے کا اس کے علاوہ کوئی علاج نہیں ہے۔ اس سلسلے میں اگر اقدام کیا جائے گا تو مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مدد فرمائے گا اور آج کے فراعنہ کا وہی انجام ہوگا جو حضرت موسیٰ کے زمانے کے فرعون کا ہوا تھا۔

سوال: اس وقت مسلم ممالک پر جو حکمراں مسلط ہیں، وہ خود ایک طرح سے انھیں طاقتوں کے کٹھ پتلی اور آلہ کار ہیں۔ ان سے یہ توقعات کیسے کی جا سکتی ہیں؟

جواب: مجھے آپ کی رائے سے ایک حد تک اتفاق ہے۔ لیکن ہمیں اس کام کو ناممکن نہیں سمجھنا چاہیے۔ اگر ان کے اندر غیرت اسلامی اور حمیت اسلامی جاگ اُٹھے، اگر یہ لوگ اپنے خاندانی، ذاتی اور محدود مفادات کے مقابلے میں اپنی قوم اور اپنے ملک کے مفادات کو ترجیح دے سکیں تو

یہ ان کے لیے بھی اور ان کے ملک کے لیے بھی بہتر ہوگا۔ ہمیں دعا کرنی چاہیے کہ خدا انھیں عقل و فہم عطا کرے اور صحیح فیصلہ کی توفیق دے۔ اگر خدانخواستہ یہ نہیں ہوتا تو ان ممالک کے عوام، جنھوں نے امریکی جارحیت کے خلاف مظاہرہ کر کے غیر معمولی جرأت دکھائی اور حکمرانوں نے بدرجۂ مجبوری انھیں اس کے اظہار کا موقع دیا، ان میں سے کچھ لوگوں کو آگے بڑھنا چاہیے۔ اس راہ میں جو دشواریاں پیش آئیں اور جو قربانیاں درکار ہوں، ان کے لیے تیار رہنا چاہیے اور قوم کو اس کام کے لیے ابھارنا چاہیے۔ اگر چہ یہ پر خطر اقدام ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی نصرت اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک کوئی قوم خود اپنی مدد کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ قرآن مجید میں دو بار کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت بدلنے کے لیے تیار نہ ہو۔

اِنَّ اللّٰهَ لَايُغَيِّرُ مَابِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ط (الرعد:۱۱)

اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی۔

سوال: اس ملک میں صدیوں سے ایک طبقاتی نظام قائم ہے، جس نے بڑی تعداد میں خلق خدا کو جکڑ رکھا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کس طرح انسانوں کو وہ توقیر و احترام حاصل ہو، جو خالق کائنات نے ان کو عطا کیا ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ ہندستانی خواتین کا بڑا طبقہ بھی اپنے حقوق سے محروم ہے۔ اب ان میں یہ احساس پیدا ہونے لگا ہے کہ ہمارے مسائل کی جڑ مذہب ہے۔ مذہب ہمارا استحصال کرتا ہے۔ کیا جماعت اسلامی ہند ان سوالات پر توجہ کرے گی اور ان کا جواب فراہم کرنے کی کوشش کرے گی؟

جواب: ان سوالات کے سلسلے میں جماعت اسلامی متفکر رہی ہے اور ان سے دلچسپی لینے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ اس کی پالیسی اور پروگرام میں یہ ساری چیزیں شامل ہیں۔ بعض میدانوں میں اس نے کوشش کی ہے بعض میں اِبتدا ہوئی ہے اور بعض میں اس کی ابتدا ہونے والی ہے۔ مثلاً انسانی مساوات کا مسئلہ خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ بڑی آبادی جو پس ماندہ ہے، معاشی طور پر بھی

اور سماجی طور پر بھی، حقارت ونفرت سے دیکھی جاتی ہے۔ انسانی عزت وشرف سے محروم ہے بلکہ مذہب کے نام پر بھی انھیں محروم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس تکلیف دہ صورت حال سے نمٹنے کی جس حد تک جماعت کوشش کرسکتی ہے کرے گی۔ اس کی کوشش ہوگی کہ انسان کے بارے میں یہ تصور کہ سب انسان ایک ماں باپ کی اولاد ہیں، سب برابر ہیں اور سب عزت اوراحترام کے مستحق ہیں۔ نہ کوئی اونچا ہے نہ نیچا۔ اونچ نیچ کا معیار پیدائش نہیں بلکہ خداترسی، حسنِ اخلاق اور انسانیت ہے۔ یہ بات عام ہو اور اسی معیار کو لوگ اختیار کریں۔

رہ گیا دوسرا سوال، خواتین کے سلسلے میں بعض حلقوں کی طرف سے اسلام کی پوزیشن مسخ کرکے پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور بعض مسلم خواتین بھی اس پروپگنڈے سے متاثر ہورہی ہیں۔ ہم واضح کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن وسنت کی روشنی میں ہر فرد خواہ مرد ہو یا عورت اپنی علاحدہ شخصیت کا حامل ہے اور یکساں محترم اور برابر ہے۔ جنس اس میں رکاوٹ نہیں۔ ایک عورت زیادہ متقی، زیادہ پرہیزگار اور زیادہ نیک ہو تو وہ ہزاروں مردوں سے بلند ہوسکتی ہے اور رہی ہے۔ ہماری تاریخ میں حضرت عائشہؓ اور دوسری امہات المومنینؓ کا مقام بے حد بلند ہے۔ اسلام نے جس طور سے خواتین کو جاہلی ماحول سے نکال کر رتبۂ بلند عطا کیا وہ سب کو معلوم ہے۔ قانونی طور پر عورت مرد سے کم نہیں۔ اس کا خون مرد کے خون سے کم سرخ نہیں ہوتا۔ لیکن صلاحیتوں اور ذمہ داریوں میں فرق ہوتا ہے۔ آپ غور کریں کہ سب انسان اگر یکساں ہوتے تو کیا کوئی منظّم معاشرہ وجود میں آسکتا تھا؟ نہ کوئی حاکم ہوتا نہ محکوم۔ یہ فرق تو انسانی زندگی کی تنظیم کے لیے ضروری تھا۔ ہماری عقل بھی گواہی دیتی ہے کہ کچھ لوگوں کی صلاحیتیں زیادہ ہوں اور کچھ کی کم۔ کچھ حاکم ہوں اور کچھ محکوم، کچھ آمر ہوں اور کچھ مامور، لیکن امارت وحکمرانی باعث عزت ہے نہ باعث شرف۔ زندگی کے بے شمار اعمال ایک عورت سے اُسی طرح مطلوب ہیں جس طرح کہ ایک مرد سے۔ ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دائرۂ کار ان کا مختلف ہے، جس طرح کسان یا تاجر کا دائرۂ کار ایک حاکم کے دائرۂ کار سے مختلف ہوتا ہے۔ اُسی طرح گھر اور خاندان میں ایک عورت کا دائرۂ کار مرد سے مختلف ہوتا ہے۔ اگر اس اصول کو نہ تسلیم کیا گیا تو پھر کوئی خاندان باقی نہیں رہ سکتا۔

اس حقیقت کو جن معاشروں میں نہیں سمجھا گیا، وہاں آپ دیکھ لیجیے خاندان تباہ ہور ہے ہیں۔ البتہ جہاں تک حقوق انسانی کی بات ہے تو اس میں عورت کو پوری طرح برابر کا حق دینا چاہیے اور اسلام نے دیا ہے۔ اگر ہماری فقہ میں کوئی بات اس کے خلاف آتی ہے تو وہ محلّ نظر اور قابل اصلاح ہے۔ خواتین کو بھی سمجھنا چاہیے کہ اگر اسلام نے وراثت کی تقسیم میں تفریق کی ہے تو اس کا سبب وہ اعمال ووظائف ہیں جو مرد کے الگ ہیں اور عورت کے الگ۔ نبی ﷺ کے عہد میں عورتیں معاش کے میدان میں بھی کام کرتی تھیں، باغات میں کام کرتی تھیں اور مجبوری کے وقت جنگ میں بھی شریک ہوتی تھیں۔ البتہ جو چیز مجبوری میں کی جاتی ہے وہ عمومی نہیں ہوتی۔

سوال: گلوبلائزیشن کے نام پر عالمی استعمار کا جو غلبہ ہو رہا ہے، اس کے سدّ باب کے لیے کیا ہونا چاہیے؟

جواب: پہلی بات یہ ہے کہ گلوبلائزیشن کے کچھ پہلو اچھے ہیں اور کچھ برے۔ اگر اس کے پس منظر میں کام کرنے والی سرمایہ دارانہ ذہنیت کو لگام دیا جا سکے، دولت کے ارتکاز کو روکا جا سکے اور عوام کی بڑی تعداد کو محروم رکھنے کی ذہنیت میں کمی کی جا سکے تو اس کا یہ فائدہ ہوسکتا ہے کہ بیرونی مقابلے کی وجہ سے اندر کی سرمایہ دارانہ قوتوں کو اپنے مال کی قیمت میں کمی کرنی پڑے۔ لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ باہر کی ملٹی نیشنل کمپنیاں آ کر معاشی استعمار کی راہ ہموار کرتی ہیں۔ کانگریس نے اس سلسلے میں ایک حد تک محتاط قدم اُٹھائے تھے۔ لیکن جن کے ہاتھوں میں اب اقتدار آیا ہے، وہ تو بڑی تیزی سے اس راہ میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس پالیسی کے نقصانات کو ہمیں عام کرنا چاہیے۔ ہمیں دوسروں کا غلام نہیں بننا چاہیے۔

سوال: ملک میں مسلمانوں کی مساجد اور مدارس کو جس طرح نشانہ بنایا جا رہا ہے، اس سے بعض ذہنوں میں مایوسی اور بے چینی پیدا ہو رہی ہے۔ ایک ذہن یہ بن رہا ہے کہ طاقت سے طاقت کا جواب دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے؟

جواب: گجرات میں جو کچھ ہوا اور بعض ہندو طاقتیں جارحانہ ہندوتو کا جو تصور پیش کر رہی ہیں، اس کے بارے میں پہلی بات تو مسلمانوں کو یہ سمجھانے کی ہے کہ ان کا اپنا سیاسی ایجنڈا ہونا چاہیے یعنی یہ کہ جارح قوتیں اقتدار میں نہ آنے پائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سماجی اور سیاسی سطح پر مشترکہ پلیٹ فارم بنا کر جو بھی کوششیں ہو سکتی ہوں وہ سب کی جانی چاہییں۔ جہاں تک ہندو دھرم کا تعلق ہے، اس میں ایک روایت رواداری، انسانیت سے محبت اور احترام کی پائی جاتی ہے، اس کی نمایندگی گاندھی جی کی شخصیت میں ملتی ہے۔ ہندو بھائیوں سے گزارش ہے کہ وہ اسی روایت کو آگے بڑھائیں۔

ہندو تاریخ کا دوسرا پہلو جارحانہ ہے۔ یہ کوئی نیا عنصر نہیں ہے۔ پہلے بھی رہا ہے۔ شروع میں اگر کچھ قومیں شودر بنائی گئیں تو وہ اسی جارحانہ ہندوازم کا شکار ہوئیں۔ اس کے لیے جو مذہبی جواز فراہم کیا گیا وہ پہلے ان کی مقدس کتابوں میں نہیں تھا۔ رگ وید کا وہ اشلوک جس میں یہ کہا گیا ہے کہ برہما کے سر سے برہمن پیدا ہوا ہے، سینے سے چھتری، پیٹ سے ویش اور پاؤں سے شودر، اس کے بارے میں اہل علم کا خیال ہے کہ الحاقی ہے اور بعد کا اضافہ ہے۔ ابتداءً رگ وید میں نہیں تھا۔ رگ وید کے جو مصنفین ہیں، ان میں بھی بہت سے لوگ پست اقوام کے تھے، خواتین بھی اور مرد بھی۔ اسی طرح اپنشد کے لکھنے والوں میں بھی مختلف ورنوں کے لوگ تھے۔ مرد بھی اور خواتین بھی۔ بعد میں ہندو مذہب کے پیشواؤوں نے جس طرح کے تصرفات کیے وہ تاریخ کا تکلیف دہ باب ہے۔ اس پر ہمارے ہندو بھائیوں کو غور کرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ ان کا اصل دین کیا تھا۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، اپنے دفاع کا حق تو ہمیں ہمیشہ حاصل رہا ہے اور ساری دنیا اسے تسلیم کرتی ہے۔ خود ہمارے مذہب کی یہ تعلیم ہے کہ جو شخص اپنی حفاظت میں جان دے وہ شہید ہے یا اپنے مال، اپنی عزت و آبرو کی حفاظت میں جان دے وہ شہید۔ اسی طرح جو اپنے دین کی حفاظت میں جان دے وہ شہید ہے۔ اس کے درجات بہت بلند ہیں۔ دفاع کے حق کو کوئی روک نہیں سکتا۔ البتہ یہ محلِ نظر ہے کہ اگر کوئی کارروائی ہمارے خلاف ہوتی ہے تو ہم اس کا مقابلہ کن اصولوں اور کن طریقوں سے کریں۔ اپنے تحفظ کا سارا سامان ہمیں آئینی حدود میں

کرنا چاہیے اور حوصلہ بلند رکھنا چاہیے۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ہمیں خود کو بے وجہ قربانی کا بکرا بھی نہیں بنانا چاہیے۔ گجرات کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ جہاں مسلمانوں نے عزم وحوصلہ سے مقابلہ کیا اپنی حفاظت میں کامیاب رہے، اور جہاں خوف میں آکر بھاگے وہاں مارے گئے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ پست کردہ اقوام سے جنھیں اونچی ذات کے لوگوں نے ہمارے خلاف استعمال کیا ہے ہمارے اچھے تعلقات قائم ہوں۔ ہمیں انھیں سمجھانا چاہیے کہ وہ دوسروں کا آلہ کار نہ بنیں۔ اس طرح آپ اپنی انسانیت کھوئیں گے۔ خدا کو کیا جواب دیں گے؟ اور اپنے ضمیر کو کس طرح مطمئن کریں گے؟ ہمیں ان کے اندر چھپی ہوئی انسانیت کو ابھارنا چاہیے۔

بعض اوقات مسلم نوجوان بھی جذبات میں آکر ایسا اقدام کر بیٹھتے ہیں، جس کے نتائج برے نکلتے ہیں۔ کبھی کوئی آدم سینا کی بات کرتا ہے، کبھی انتقامی کارروائی کی سوچتا ہے۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایسی تنظیمیں نہ بن سکی ہیں نہ بن پائیں گی۔ لہٰذا اس خیال کو چھوڑ دینا چاہیے۔ اشتعال انگیزی اور انتقامی کارروائی سے بالعموم گریز کرنا چاہیے۔ البتہ متحد ہوکر دفاع کی صورت نکالی جاسکتی ہے۔ بعض اوقات ہماری ہی قوم کے لوگ دشمن کا آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ افسوس کہ ایسی صورت گجرات میں بھی پیش آئی ہے۔ ایسے لوگوں سے ہمیں ہوشیار رہنا چاہیے۔

سوال: جماعت اسلامی نے اپنے کام کا آغاز اس دعوے کے ساتھ کیا تھا کہ وہ نظام باطل کو ختم کر کے نظام حق کو قائم کرے گی۔ چنانچہ ابتدائی دور میں جماعت کا نصب العین حکومت الٰہیہ کا قیام تھا۔ بعد میں قرآنی اصطلاح کو اختیار کرتے ہوئے جماعت نے اقامت دین کو اپنا نصب العین بنالیا۔ تاہم اقامت دین میں بھی یہ بات واضح ہے کہ آخری ہدف ملک میں دین کا قیام ہے۔ بعد میں ایسا نظر آتا ہے کہ فکری اور نظریاتی طور پر تو نہیں البتہ علمی سطح پر بتدریج جماعت اس نصب العین سے دستبردار ہوگئی ہے۔ اب جماعت کا کام صرف غیر مسلموں تک اسلام کی دعوت پہنچانا اور مسلم معاشرہ کی اصلاح وتربیت تک محدود رہ گیا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر نظام وقت پر دین کا قیام اب اس کے ایجنڈے میں شامل نہیں ہے؟

جواب: میں آپ کی رائے سے اتفاق نہیں کرتا۔ جماعت اسلامی کی تاریخ کا یہ مطالعہ صحیح نہیں ہے۔ حکومت الٰہیہ کا لفظ جماعت اسلامی کے دور اوّل کے افراد کا اختیار کردہ تھا۔ اس سے سیاست اور اقتدار کی غیر معمولی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ حالانکہ دین کے دوسرے پہلو اس سے کم اہم نہیں ہیں۔ اقامت دین کے لفظ کے استعمال سے ہم اس خرابی سے بچ جاتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہم تحریک کو ہندستان کے حالات کے مطابق مرحلہ وار آگے بڑھا سکتے ہیں۔ جس مرحلے میں، جس چیز پر زور دینے کی ضرورت ہو، ہم اُسی پر زور دیں گے اور غیر ضروری سوالات اور مسائل سے بچ سکیں گے۔ ہمارا لٹریچر بھی اس حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے۔ اسلام میں ہر چیز کا ایک مقام ہے، عبادت کا، اخلاق کا اور سیاست کا۔ دین کا جامع تصور پیش کرنے کے لیے اقامت دین سے بہتر کوئی لفظ نہیں ہے۔ مزید یہ کہ یہ قرآن کا عطا کردہ لفظ ہے۔ جب ہم نے غور وفکر کے بعد اس اصطلاح کے ذریعے اپنے نصب العین کا اظہار کیا تو دنیا کی دوسری اسلامی تحریکات نے بھی اسی لفظ کو اختیار کرلیا۔ اس لفظ کو اختیار کرنے سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ ہم غلبۂ دین سے غافل ہو گئے یا ہو جائیں گے۔ ایسا نہ ہوا اور نہ ہوگا۔ غلبۂ دین کی حیثیت آخری منزل کی ہوگی اور آپ جانتے ہیں کہ وہاں تک پہنچنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر وقت اس کا تذکرہ کیا جاتا رہے۔ حکمت کا تقاضا ہے کہ جس مرحلے میں جو چیز زیادہ اہم ہو اس پر زور دیا جائے۔

سوال: کیا آخری منزل کا تصور میدان میں کام کرنے والے ہر کارکن کے ذہن میں واضح ہے؟

جواب: میرے خیال میں واضح ہے۔ یہ بات بھی سامنے رہنی چاہیے کہ اصطلاحیں کوششوں کی ترجیحات اور رخ متعین کرتی ہیں۔ اسلام نہ صرف یہ کہ ایک عقیدہ ومذہب ہے، عبادات کا ایک نظام ہے اور پورا نظام حیات ہے۔ وہ حکومت کا بھی ایک نظام ہے۔ جس کی بنیاد خدا کی حاکمیت پر ہے۔ اس بات کی وضاحت کے لیے حکومت الٰہیہ کے لفظ کا استعمال کیا گیا تھا۔ مگر یہ لفظ قرآن مجید میں نہیں ہے۔ قرآن میں اسلام کی دعوت کی تفصیلات مرحلہ وار بیان کی گئی ہیں۔ ابتدا میں توحید، آخرت، رسالت، عبادات، اخلاقی اصول اور معاشرہ کے صرف چند اصول بیان کیے گئے تھے۔

ایک عرصہ دراز تک یہی سلسلہ قائم رہا۔ شرک کی تفصیلات بھی بیان نہیں ہوئی تھیں۔ حلّت وحرمت کے قوانین بھی بعد میں بیان ہوئے اور استخلاف کا تصور یا حکومت کے تصور کا ذکر اس وقت ہوا جب نبی کریم ﷺ مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ تشریف لائے۔ اس میں بھی تدریج سے کام لیا گیا۔ اگرچہ آج ہمیں سارا اسلام لوگوں کے سامنے پیش کرنا ہے۔ اس میں کوئی کمی یا بیشی نہیں کرنی ہے۔ لیکن ہماری کوشش یہ رہی ہے کہ اس سلسلے میں وہ لفظ استعمال کیا جائے، جو قرآن میں مذکور ہے اور زیادہ جامع ہے۔ جب ہم اقامت دین کہتے ہیں تو اس سے حکومت الٰہیہ کا نصب العین خارج نہیں ہوتا، لیکن اس سے وہ عجلت (ایمرجنسی) سامنے نہیں آتی، جو حکومت الٰہیہ کا لفظ بولنے سے آتی ہے۔ اس لیے ہر مرحلے کے لحاظ سے الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ تاکہ لوگوں کی توجہ ان کے حصول پر ہو اور بے چینی اور اضطراب کی کیفیت پیدا نہ ہو۔ ان تدریجی مراحل سے اجتناب کرکے جب بھی اقدامات کیے جائیں گے ان کے نتائج اچھے نہیں ہوں گے۔

سوال: مولانا مودودیؒ نے خطبۂ مدراس میں واضح طور پر کہا تھا کہ مسلمانوں کو ہر اُس کوشش سے اجتناب کرنا چاہیے، جس سے قومی کشمکش یا منافرت پیدا ہوسکتی ہو۔ مثلاً انہوں نے کہا تھا کہ پارلیمنٹ، اسمبلیوں اور سرکاری ملازمتوں میں نمایندگی کے سوال پر ہندوستانی مسلمانوں کو کوئی تحریک نہیں چلانی چاہیے۔ لہٰذا جماعت اسلامی ہند کا یہ فیصلہ کہ اسلام اور مسلمانوں کے اہم مفادات کی خاطر انتخابی سیاست میں حصہ لیا جائے گا یا یہ بات کہ ملازمتوں اور اسمبلیوں میں مسلمانوں کی نمایندگی سے متعلّق جو کوششیں ہورہی ہیں، ان میں بھی جماعت اسلامی شامل ہوگی کیا یہ اس ہدایت کی نفی نہیں ہے؟

جواب: جن حالات میں تحریک اسلامی کے موسس نے یہ بات کہی تھی، ان حالات میں یہ اصول صحیح تھا۔ اس کا نفاذ جماعت اسلامی نے اخلاص کے ساتھ کیا اور یکسوئی کے ساتھ اس پر عامل رہی۔ لیکن یہ پالیسی کا مسئلہ تھا اور پالیسی کا تعلق حالات اور ظروف سے ہوتا ہے۔ اس پر نظر ثانی کی ضرورت پڑسکتی ہے۔ یہ اصول ہمارے یہاں تسلیم شدہ ہے۔ ہم نے بدلتے ہوئے

حالات میں جب ان چیزوں پر غور کیا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ اس میں تبدیلی کی جائے۔ ملک کے انتخابی عمل پر ہم اپنے اصول وضوابط کے تحت کس طرح اثر انداز ہو سکتے ہیں، اس پر ہمیں سوچنا چاہیے۔ چنانچہ اسے پالیسی کا سوال سمجھ کر ہم نے اس پر نظر ثانی کی۔ زندہ تحریکیں ایسا ہی کرتی ہیں۔ اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس سے کوئی اسلامی اصول متاثر نہیں ہوتا اور نہ اس سے کسی حکم قرآنی یا سنت کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

سوال: جماعت اسلامی نے اپنے ارکان کو ووٹ دینے کی اجازت دی ہے۔ لیکن کیا صرف ارکان جماعت کے ووٹ دے دینے سے فسطائی طاقتوں کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکا جاسکتا ہے۔ کیا اس سلسلے میں پوری امت کی رہ نمائی کی ضرورت نہیں؟

جواب: جماعت صرف اس پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ وہ عام رائے دہندگان سے بھی کہتی ہے کہ انھیں آگے بڑھ کر اپنا رول ادا کرنا چاہیے۔ جو لوگ جمہوری فضا کو ختم کرنا چاہتے ہیں یا جو مذہبی آزادی پر قدغن لگانا چاہتے ہیں، انھیں ہر قیمت پر اقتدار میں آنے سے روکا جانا چاہیے۔ یہی مشورہ ہم مسلمانوں کو دیتے ہیں اور اپنے ارکان اور وابستگان کو بھی دیتے ہیں۔

سوال: سیکولر سیاسی جماعتوں کے رویّے سے مایوس ہو کر اب مسلمان خود اپنی سیاسی پارٹی بنانے کے بارے میں سوچ رہے ہیں تاکہ معاہداتی سیاست کے اس دور میں مسلمانوں کے حقوق کا زیادہ بہتر طریقے سے تحفظ کیا جاسکے اس پر آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: یہ سوال بہت ٹیڑھا ہے۔ اس کے حق میں بھی لوگوں نے لکھا ہے اور اس کے خلاف بھی۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ابھی اس کے لیے نہ تو فضا سازگار ہے اور نہ مسلمان اس کے لیے تیار ہیں کہ کوئی پارٹی بنائیں۔ پارٹی خواہ صرف مسلمانوں کی پارٹی ہو یا غیر مسلموں کے ساتھ مل کر بنائی جائے، کسی چیز کے لیے ابھی حالات سازگار نہیں ہیں۔ اس وقت جو چیز موثر اور کارگر

ہوسکتی ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی تمام تنظیموں اور جماعتوں کو متحد ہوکر ایک مشترک ایجنڈا ترتیب دینا چاہیے اور اپنے اپنے طور پر اس کی بجا آوری کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ آپس کے اختلافات اور انتشار و تصادم سے بچا جائے اور ووٹوں کو تقسیم نہ ہونے دیا جائے۔ اس ایجنڈے کے بنانے میں اگر غیر مسلم ہمدردوں کا تعاون واشتراک بھی حاصل ہوسکے تو بہتر ہوگا۔

سوال: جماعت اسلامی کے بارے میں ایک تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ وہ عوامی تحریک نہیں ہے، بلکہ خواص کی تحریک ہے۔ اس کے پاس پڑھے لکھے افراد کے لیے تو پروگرام ہے، لیکن عوام کے لیے کوئی پروگرام نہیں ہے۔ ایک ایسے ملک میں جس میں عوام کی اکثریت ناخواندہ ہو اور ایک ایسی تحریک کے لیے جو انقلابی پروگرام اور نصب العین رکھتی ہو عوام سے غیر متعلق رہنا کہاں تک درست ہے؟

جواب: آپ کا احساس بڑی حد تک صحیح ہے۔ لیکن ہم صرف خواص کی پارٹی نہیں ہیں۔ عوام بھی ہمارے پیش نظر رہے ہیں۔ لیکن ان میں ہمارا نفوذ بہت محدود ہے۔ لیکن اب ہماری کوشش ہوگی کہ عوام میں بھی کام کریں۔ طلبہ وطالبات میں کام کے لیے ہم نے علاحدہ ایس آئی او اور جی آئی او کی شکل میں ذیلی تنظیمیں بنائی ہیں۔ ضرورت متقاضی ہوئی تو ہم مزید ذیلی تنظیمیں بنا سکتے ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ ہم عوام تک پہنچیں۔ انھیں اسلام کے علم، صحیح تصور دین اور اس کے تقاضوں سے واقف کرائیں اور ان کی اصلاح وتعمیر میں حصہ لیں۔

خطاب:

جماعت اسلامی کے اہداف

جماعت اسلامی ہند نے اس ملک میں پچاس سال سے زیادہ کا سفر طے کیا ہے۔ جماعت کی ایک امتیازی خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس نے اسلام کو صرف ایک عقیدہ اور محدود معنوں میں مذہب سمجھنے کی بجائے ایک مکمل نظام حیات اور جامع نظام زندگی کی حیثیت سے دیکھا ہے اور اسی کی دعوت دی ہے۔ عام بندگان خدا تک اس نے یہی پیغام پہنچایا ہے اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب یہ آواز عام ہوگئی ہے۔ آج اسلامی موضوعات پر لکھنے والا ہر شخص خواہ وہ اخباروں میں لکھے یا رسالوں میں، یہی نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے۔

جماعت اسلامی کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک انسانی اور آفاقی تحریک ہے۔ ملک اور بیرون ملک سارے انسانوں کو مخاطب کرتی ہے۔ اس لیے کہ اسلام ساری دنیا کے لیے اور تمام عالم انسانیت کے لیے دین کے طور پر آیا ہے اور جماعت یہی دعوت لے کر سرگرم عمل رہی ہے۔

ان دونوں بنیادی چیزوں کی وجہ سے جماعت اسلامی ہند کوشش کرتی رہی ہے کہ وہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات اور اس کے تقاضوں سے خود کو بے تعلق نہ رکھے۔ بروقت ان کا مناسب نوٹس لے اور صحیح اقدام کرے۔ اپنی دعوت کو رائج الوقت زبان میں پیش کرے۔ اس دور کے جو افکار و نظریات ہیں، ان پر اپنا نقطۂ نظر واضح کرے اور ضرورت پڑے تو تفصیل

سے ان پر تنقید کرے، اس پس منظر میں اسلام کا پیغام واضح کرے اور اسے بنی نوع انسان تک پہنچائے۔

جماعت کے پیغام کی یہ تینوں مذکورہ خصوصیات، جماعت کے قیام کے روز اول سے ہی رہی ہیں۔ آیندہ بھی ہماری یہ کوشش ہوگی کہ ان خصوصیات کی روشنی میں پیش نظر کام کو ہم آگے بڑھائیں۔ موجودہ حالات میں جماعت اسلامی ہند کی پہلی کوشش یہ ہوگی کہ اسلام کی دعوت، اسلام کا پیغام اور اسلام کا نظام حیات پوری تفصیل کے ساتھ اعلی پیمانے پر ملک کے پڑھے لکھے اور سوچنے سمجھنے والے طبقہ کے سامنے آئے۔ جماعت اسلامی نے ابتدا میں کمیونزم، سوشلزم اور سیکولرزم اور اس طرح کے دیگر نظریات اور ان کے مسائل پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے، جو ہمارے لٹریچر میں موجود ہے۔ وہ ایک وقت تھا اور اس کے کچھ تقاضے تھے، انھیں پورا کیا گیا۔ آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں، اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس ملک کی تہذیب، کلچر، ثقافت، مذہب بلکہ مذاہب کا تفصیل سے مطالعہ کریں اور اس پس منظر میں اسلام کا پیغام اور اس کی دعوت پورے زور وقوت اور اعتماد کے ساتھ پیش کریں۔ اگر چہ ماضی میں بھی جماعت کا یہی موقف رہا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں جماعت نے جو کچھ کیا ہے اس میں مزید اضافے کی ضرورت ہے۔ اس لیے جماعت اسلامی کی اولین ترجیح یہ ہوگی کہ اسلام کا پیغام ہندوستانی تاریخ، تہذیب اور روایات کے پس منظر میں مضبوط دلائل کے ساتھ تفصیلی اور اطمینان بخش طریقے سے پیش کیا جائے اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دی جائے۔ یہ ہماری بنیادی ذمے داری ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اہم کام ہمیں منصوبہ بند طریقے سے انجام دینا چاہیے۔ نہ یہ کام صرف تمناؤں سے ہوگا اور نہ آرزوؤں سے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ کچھ ایسے اچھے اور باصلاحیت افراد تیار کیے جائیں جو اس مقصد کے لیے اپنی زندگیاں وقف کریں۔ یہاں کی تہذیب، کلچر اور مذاہب کا نہایت عمیق انداز سے مطالعہ کریں اور پھر معقول اور اطمینان بخش طریقے سے اسلام کو وسیع پیمانہ پر پیش کریں۔

اس کے ساتھ اس بات کی بھی ضرورت ہوگی کہ ایسے داعی افراد پیدا ہوں، جنھیں ان چیزوں کا ایک حد تک علم ہو اور وہ عوام الناس میں دعوت کا کام کریں۔ جماعت ان کی ضروریات کو سمجھے اور ان کی تکمیل کا سامان کرے۔

یہ درست ہے کہ دعوت کی راہ میں بعض موانع کھڑے کیے جارہے ہیں اور تبدیلی مذہب کے خلاف قانونی پابندیاں لگائی جارہی ہیں، جو دستور ہند میں ثبت بنیادی حقوق کی اسپرٹ کے سراسر منافی ہیں۔ تاہم ہماری کوشش ہوگی کہ آئینی حدود میں دعوت کا کام جاری رہے۔

مختصراً یہ کہ جماعت کو اچھے مفکر بھی چاہییں، اچھے مصنف بھی اور اچھے داعی بھی اور ایسے لوگوں کو کام میں لگانے کی مناسب مشینری بھی جماعت میں ہونی چاہیے۔

دعوت کے بعد میرے نزدیک ملت کے مسائل کا نمبر ہے۔ جماعت ملت کے مسائل اور مسلم معاشرے کی اصلاح وتعمیر سے غافل کبھی نہیں رہی۔ اپنی حد تک ان میں دلچسپی لیتی رہی ہے۔ لیکن آج کے حالات متقاضی ہیں کہ پہلے سے زیادہ ان کی طرف توجہ دی جائے۔

کچھ کام ایسے ہیں جنھیں ملت کے مشترک پلیٹ فارم سے انجام دینے کی ضرورت ہے جیسے بابری مسجد کا قضیہ، اس کام کے لیے مسلم پرسنل لابورڈ کا پلیٹ فارم استعمال کیا جارہا ہے۔ جماعت اسلامی اس کوشش میں اوروں کے ساتھ پورے طور پر شریک ہے اور ان شاء اللہ آیندہ بھی شریک رہے گی۔ بابری مسجد کے علاوہ ملت کے کئی اور مسائل بھی ہیں، جن پر مل جل کر غور وفکر کے بعد قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ مثلاً ملت کا سیاسی مسئلہ، جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ اس مسئلے پر غور کر کے کوئی لائحہ عمل تجویز کرے گی۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ہمارے سیاسی مسئلے کا حل مسلمانوں کی ایک علاحدہ سیاسی پارٹی بنانا نہیں ہے۔ البتہ ہماری مختلف تنظیمیں مل جل کر ایک متفقہ ایجنڈا تیار کر سکتی ہیں اور اپنے اپنے طور پر اس ایجنڈے کو بروئے کار لاسکتی ہیں۔ ملت کا ایک متفقہ ایجنڈا تیار کرنا اور اس کے لیے اپنے اپنے طور پر اقدام کرنا وقت کی ایک بڑی ضرورت ہے۔ ساری تنظیموں کو اس سلسلے میں اقدام کرنا چاہیے۔ جماعت اسلامی بھی یہ کام شروع کرے گی اور اپنے طور پر جو کچھ کر سکتی ہے، اسے ضرور کرے گی۔

بہت سے مسائل ایسے بھی ہیں جن میں جماعت اسلامی کو خود اپنے طور پر سوچنے، لائحہ عمل تیار کرنے اور اقدام کرنے کی ضرورت ہے۔ تعلیم، دینی واخلاقی اصلاح، معاشرتی زندگی کا سدھار، معاشی مسائل کا حل، جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت وغیرہ۔ تعلیمی مسئلے کو لیجیے

اس میدان میں جماعت اسلامی اس وقت جو کام انجام دے رہی ہے ان سے آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے کی ملکی پیمانے پر زوردار مہم شروع کرنی چاہیے۔ عصری تعلیم اور دینی تعلیم کے میدانوں میں ملت کو اوپر اٹھانے کے لیے ایک جامع منصوبہ تیار کرنا چاہیے۔ تعلیم کے میدان میں جو شخصیات نمایاں کام انجام دے رہی ہیں یا جو ادارے گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں، ان کا تعاون حاصل کرنا چاہیے اور خود بھی اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے مطلوبہ افراد کی تیاری اور اداروں کی تشکیل کے لیے اقدام کرنا چاہیے۔ اس میدان میں جماعت کو خود بھی پہل کرنی چاہیے اور دوسروں کو بھی ہم خیال بنا کر اپنے ساتھ لینے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ملت کے مسائل کے علاوہ ملک کے بھی کچھ مسائل ہیں، جن کی طرف توجہ ضروری ہے ہندستان کو غلامی سے آزاد کرانے کے بعد تحریک آزادی کے عظیم راہ نماؤں نے اس ملک کی تعمیر جمہوری خطوط پر کرنا طے کیا۔ انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہندستان ایک جمہوری ملک ہوگا۔ اس کے ہر شہری کو یکساں مقام اور یکساں حقوق حاصل ہوں گے۔ ملک کی تعمیر و ترقی میں اسے یکساں طور پر حصہ لینے کا موقع حاصل ہوگا۔ ملک کے دستور میں یہ بات صراحت کے ساتھ نوٹ کی گئی کہ یہاں مذہب کی بنیاد پر کوئی تفریق اور امتیاز نہیں برتا جائے گا۔ ہر مذہب کا یکساں احترام کیا جائے گا۔ مذہب اور عقیدے کے معاملے میں ہر شخص کو پوری آزادی حاصل ہوگی۔ دستور میں سیکولرزم کا لفظ اسی معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور اب تک انھیں بنیادوں پر ملک کا جمہوری نظام چلتا رہا ہے۔ لیکن ہندستان کا یہ کیرکٹر اب زیر بحث آگیا ہے۔ بعض گوشوں سے اس کیرکٹر پر یورش شروع ہوگئی ہے۔ کچھ لوگ جو منصب اقتدار پر فائز ہیں ان کوششوں کی خوبصورت توجیہ و تاویل میں مصروف ہیں۔ دوسری طرف کچھ افراد اور کچھ حلقے ایسے ہیں، جو ایسے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور ایسے اقدامات کرنا چاہتے ہیں، جو کسی طرح پسندیدہ نہیں ہیں۔ بلکہ بعض پہلو سے الٹا مضر ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان دونوں ہی طریقوں کی مذمت اور تردید میں جو آوازیں ملک کے مختلف گوشوں سے اٹھ رہی ہیں اور ملک کے جمہوری اور سیکولر کیرکٹر کو

برقرار رکھنے کے لیے جو کوششیں کی جارہی ہیں، جماعت اسلامی ان کا خیر مقدم کرتی ہے اور خود اپنے طور پر جو کچھ کرسکتی ہے، اس سے دریغ نہیں کرتی۔ اس غرض سے جماعت نے ریاستی اور ملکی قانون ساز اداروں کے الیکشن پر اثر انداز ہونے کا فیصلہ کیا اور اس فیصلے پر عمل کرتی رہی۔ تجربہ سے اس عمل میں جو کوتاہیاں نظر آئی ہیں، جماعت کوشش کرے گی کہ آیندہ ان کا ازالہ ہو اور یہ کام منصوبہ بند طریقے پر انجام پائے۔ یہ بات کہ جماعت اس سلسلے کے تمام کام خود انجام دے یا اس کے لیے ذیلی ادارے بنائے، غور کے قابل ہے۔

دوسری بات جس کی طرف میں توجہ دلانا چاہتا ہوں، وہ ملک کے وہ مسائل ہیں جن کا تعلق مسلم اور غیر مسلم سارے عوام سے ہے۔ مثلاً ملک میں پائی جانے والی عام غربت۔ چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ پوری دنیا میں خط غربت سے نیچے رہنے والے افراد کا ایک تہائی حصہ ہندستان میں رہتا ہے۔ اسی طرح ناخواندہ افراد کا تناسب ہمارے ملک میں غیر معمولی ہے۔ معاشرے کے مختلف طبقات کو ان کی پسماندگی کی وجہ سے طرح طرح کے استحصال کا شکار بنایا جارہا ہے۔ اس میں عورتیں بھی ہیں اور بچے بھی، نیچی ذاتوں کے افراد بھی ہیں اور قبائلی بستیوں میں بسنے والے لوگ بھی۔ جماعت اسلامی ان عام انسانی مسائل کی طرف حتی الامکان خود توجہ کرے گی اور ان کے حل کے سلسلہ میں دوسری تنظیموں اور آزاد اداروں اور غیر سرکاری رضا کار تنظیموں (NGO's) کے ساتھ تعاون کرے گی۔

بہت سے لوگ عام ضروریات زندگی سے محروم ہیں، کہیں پانی دستیاب نہیں ہے تو کہیں طبی امداد میسر نہیں ہے۔ بے شمار جگہوں پر آزادی کے پچاس سال گزر جانے کے باوجود اب تک بجلی جیسی بنیادی سہولت نہیں پہنچ سکی ہے۔ بہت سے گاؤں اور مواضع ایسے ہیں، جن میں بجلی کا نام و نشان نہیں ہے۔ ایک طرف یہ حال ہے، دوسری طرف ہم سپر پاور بننا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے میزائیلیں تیار کررہے ہیں اور بے پناہ ذرائع و وسائل استعمال کررہے ہیں۔

ہم نے جن باتوں کی نشان دہی کی ہے، ان کے لیے مختلف گوشوں سے آوازیں اٹھ رہی ہے، اگرچہ یہ آواز بہت خفیف اور نحیف ہے اور بالعموم اتنی کمزور آوازوں کی شنوائی بھی نہیں

ہوتی مگر قطع نظر اس سے کہ شنوائی ہو یا نہ ہو جماعت اسلامی آواز اٹھاتی رہے گی۔ ملکی سطح پر بھی اور ملی سطح پر بھی۔ اس لیے کہ ہمارے پاس جو نظام زندگی ہے، اس کی دو محکم بنیادیں عدل اور احسان ہیں۔ احسان تو دور کی چیز ہے ملکی عوام عدل و انصاف کے بنیادی تقاضوں سے بھی محروم ہیں، خواہ وہ سیاسی میدان میں ہو یا معاشی اور معاشرتی میدان میں۔ یہ ایسا کام ہے جس کی طرف ہمیں بھرپور توجہ دینی ہے۔ بنیادی حقوق سے محروم طبقات کو اسلام کے عادلانہ اور منصفانہ نظام پر غور و فکر کی دعوت دینی ہے۔ ان کے سامنے اسلام کے معاشرتی و معاشی عدل و احسان کے نظام کو پیش کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ پسماندہ دلت طبقہ جو یہاں بڑی تعداد میں موجود ہے، اور ملک کی آبادی میں خاصا تناسب رکھتا ہے اس کے باوجود بے عزتی، رسوائی اور ظلم و استحصال کا شکار ہے۔ افسوس ہے کہ یہ سب کچھ مذہب کے تقاضے کے طور پر کیا جا رہا ہے۔ ایسے لوگوں کو اکسپوز کرنا اور مظلوموں کے حقوق کے لیے جدو جہد کرنا ہمارا فرض ہے۔ اس سلسلے میں جماعت اسلامی کو سوچ سمجھ کر منصوبہ بند طریقے سے اقدامات کرنے چاہییں۔ کیا عجب کہ اسلام کا پیغام عدل و انصاف اخوت اور مساوات، محبت اور احسان ان کے دل کی آواز بن جائے۔

یہ وہ مسئلہ ہے جو ہماری پالیسی پروگرام میں درج ہے۔ مگر اس سلسلے میں ہم اب تک جو کچھ کام کرتے رہے ہیں، وہ بہت مختصر ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کام کو ہم مقامی اور ریاستی، علاقائی اور ملکی ہر سطح پر ایک چیلنج کی حیثیت سے لیں اور اس امر کی بھرپور کوشش کریں کہ اس کے تقاضے پورے ہوں۔ دلتوں میں یہ کام کچھ اور لوگ بھی کر رہے ہیں ہمیں ان کے ساتھ تعاون کرنے اور ان کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ملکی مسائل کے ساتھ ساتھ کچھ عالمی مسائل بھی ہیں، جو توجہ کے طالب ہیں۔ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ جماعت اسلامی ایک آفاقی اور عالمی تحریک کی حیثیت سے اٹھی تھی، اگرچہ اس کی توجہ کا اول مرکز یہ ملک تھا اور رہے گا، لیکن اس کے باوجود ہم عالمی مسائل سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ اس ضمن میں سب سے بڑی بات جو قابل غور ہے اور جس پر ہمیں سوچنا اور

اقدام کرنا ہوگا، اس کا تعلق اس استعمار جدید سے ہے، جو امریکہ اور برطانیہ کی فوجی کارروائیوں اور سیاسی ومعاشی غلبہ کی کوششوں کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔

آج عالم اسلامی جن حالات سے گزر رہا ہے، اس نے صرف مسلمانوں کو ہی نہیں بلکہ پورے عالم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ ان جدید استعماری قوتوں کی بے حیائی کا عالم یہ ہے کہ عراق کی بستیاں کی بستیاں تباہ کر دی گئیں، اس کے کتب خانے جن میں صدیوں کا علمی اور ثقافتی سرمایہ محفوظ تھا لوٹا گیا، شہر کی گنجان آبادیوں پر کلسٹر بم گرائے گئے، جس کا کوئی جواز کسی ضابطۂ قانون میں نہیں ہے۔ یہ انسانیت سوز کارنامے وہ قومیں انجام دے رہی ہیں جو حقوق انسانی کی علمبردار اور اس کی حفاظت کی مدعی ہیں اور اقوام عالم کو حقوق انسانی کا درس دیتی رہی ہیں۔ اسلام کے بارے میں ان کا کہنا رہا ہے کہ اس میں نہ تو جمہوریت ہے اور نہ حقوق انسانی کا احترام۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہاں حقوق انسانی کا احترام نہیں ہے تو پھر اور کہاں ہے؟ یہ آپ ہیں جو حقوق انسانی کو نہایت بے دردی اور شقاوت سے پامال کر رہے ہیں۔ آپ ہی نے مسلم ممالک میں جمہوریت کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی ہیں۔ بادشاہت، ڈکٹیٹر شپ اور بدترین قسم کی فوجی آمریت کی سرپرستی آپ کر رہے ہیں، عوام کی آواز کو دبانے اور جمہوری قدروں کے فروغ کی راہ میں آپ روڑے بنتے رہے ہیں۔ صدام کی آمرانہ کوششوں میں کس نے اس کی مدد کی؟ ایران پر حملے کے لیے کس نے اسے اکسایا؟ کویت پر حملے کے لیے کس کی طرف سے اسے شہ ملی؟ اور ان سارے اقدامات میں فوجی ساز وسامان اور اسباب ووسائل کن ذرائع سے اسے فراہم ہوئے؟

یہ ایک ریکارڈ ہے، اس جدید استعمار اور اس کی تباہ کاریوں کا۔ بے مثال استحصال اور ظلم و زیادتی کا۔ ضرورت ہے کہ ان حقائق پر پڑے ہوئے پردوں کو چاک کر دیا جائے، ان پر کتابیں اور پمفلٹس تیار کیے جائیں اور بڑے پیمانے پر ان کی اشاعت کی جائے۔ اس کام کو انجام دینے کے لیے ہندستان کے مسلمان دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے بہتر پوزیشن میں ہیں۔

عالم اسلام کے عوام کو اس کی بھی اجازت نہیں تھی کہ وہ حقوق انسانی کی پامالی کے خلاف اور حق وانصاف کی حمایت میں آواز اٹھا سکیں۔ اگر کبھی ان کے حق پرست علما نے کوئی بات کہنے کی

کوشش کی بھی تو وہ اپنے حکمرانوں کے سامنے ایک محضر (میمورنڈم) پیش کردینے سے زیادہ نہیں رہی۔ لیکن اس خاموش اقدام کے نتیجے میں بھی بسا اوقات انھیں مختلف قسم کے مظالم سہنے پڑے۔ مگر اب صورت حال میں کچھ تبدیلی آئی ہے۔ مسلم علما بہت محتاط انداز میں آواز اٹھا رہے ہیں اور اسے برداشت کیا جارہا ہے۔ کوشش ہونی چاہیے کہ ایسی آوازیں اٹھتی رہیں۔ ہندستانی تاریخ کے مختلف ادوار میں ظلم و ناانصافی کے خلاف آوازیں اٹھائی گئی ہیں۔ آج بھی اگر ہم ظلم کے خلاف اٹھنے والی آوازوں اور حق وانصاف اور حقوق انسانی کی حمایت میں دنیا میں ہونے والے مظاہروں کی تائید میں آگے آئیں تو ہم اپنی اچھی روایات زندہ کرسکیں گے۔

عراق پر مختلف بہانوں سے حملے کرنے، اس کے تیل کے ذخائر پر قبضہ کرنے اور اسرائیلی عزائم کی تکمیل کے لیے امریکہ اور برطانیہ نے جو عظیم تباہی و بربادی پھیلائی ہے، اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ لیکن دوسری طرف عالم انسانیت پر اس وحشیانہ اور مجرمانہ کارروائی کے خلاف ساری دنیا اور خود ان مجرم اور وحشی طاقتوں کے اپنے ملکوں میں جو آوازیں اٹھی ہیں اور اب بھی جس زور وقوت سے اور جس سطح سے اٹھ رہی ہیں، اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ امریکہ کے ایک سابق صدر جمی کارٹر نے موجودہ صدر کی اس جارحانہ اور استعماری پالیسی کے خلاف آواز اٹھائی اور برسرعام اس کی مذمت کی۔ دوسرے صدر کلنٹن نے بھی شام (سیریا) کے سلسلے میں امریکی حکومت کو انتباہ دیا کہ اس کے خلاف کوئی فوجی کارروائی نہیں ہونی چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ خود امریکہ اور برطانیہ میں ان کی اپنی حکومتوں کے خلاف مسلسل آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ عالمی ضمیر اب بھی زندہ ہے۔ پوپ نے بھی اس جنگ کے خلاف آواز اٹھائی ہے اور خدا کا خوف دلایا ہے۔ یہ باتیں قابل ستائش ہیں اور ان کی ہر طرح اور ہر سطح سے تائید ہونی چاہیے۔

گزشتہ صدی کے نصف اول میں مذہب سے بیزاری کے مختلف مظاہر سامنے آتے رہے ہیں۔ مجھے ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۲ء کے وہ ایام یاد ہیں، جب ہارڈورڈ یونیورسٹی کے باہر فٹ پاتھوں اور باغوں میں جوان مرد اور عورتیں اپنے جسم پر مختصر سے کپڑے ڈالے دن رات پڑے

رہتے تھے اور زبان حال سے اعلان کرتے تھے کہ زندگی کے نہ کوئی معنی ہیں اور نہ روحانی اور اخلاقی قدروں کی کوئی حقیقت ہے۔ بعض افراد اپنے مذہب سے تائب ہو کر نئے روحانی تجربات کی راہ پر چلنے لگے تھے۔ بعض نے یوگیوں کا لباس اختیار کیا اور یوگا کے خطوط پر جسمانی اور روحانی ورزشیں کرنے لگے۔ روحانی تسکین کے لیے ہندوستان بھی آئے اور یہاں کے روحانی پیشواؤں کی شاگردی اختیار کی۔ ہندوستانی عوام انھیں Hippies کے نام سے یاد کرتے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر نہ مغربی فکر، فلسفہ اور رجحانات اثر انداز ہو سکے اور نہ حق کے بارے میں مغرب کے تصورات انھیں مطمئن کر سکے۔ ان کی روح کو تسکین کہیں نہیں مل سکی۔ مگر تیس سال بعد جب پھر ہارورڈ یونیورسٹی میرا جانا ہوا اور کیمبرج کی سڑکوں اور باغات سے گزرنا ہوا تو زندگی کی بے معنویت اور انسانی قدروں میں غیر یقینی کی کیفیت دیکھنے میں نہیں آئی، نہ سڑکوں پر پڑے ہوئے گندے کپڑوں میں ملبوس افراد نظر آئے اور نہ باغات میں وقت گزارتے ہوئے جوڑے دکھائی دیے۔ دراصل اس وقت زندگی کی اعلیٰ قدروں، روحانی ضرورتوں اور مذہب کی طرف رجوع کے ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس کا اندازہ ہارورڈ یونیورسٹی کے شعبہ انسانیات کے ایک مشہور استاذ کی کتاب Desecularisation of the World [(۱)] سے بھی کیا جا سکتا ہے، جو مذہب کی طرف رجوع عام کا تذکرہ کرتی ہے۔ کتاب مختصر ہے لیکن غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان خواہ مشرق کا ہو خواہ مغرب کا، عیسائی ہو یا بدھ، ہندو ہو یا مسلمان مذہب کی طرف دوبارہ رخ کر رہا ہے اور ایک بار پھر ذاتی اور اجتماعی زندگی میں دینی اور روحانی قدروں کو ان کا مقام دینا چاہتا ہے۔

اگر ہم دنیا کو یہ بتا سکیں کہ مذہب فی الواقع کیا ہے؟ انسان کے کن داخلی سوالوں کا جواب ہے؟ اور یہ بھی بتا سکیں کہ مذہبی نظریات اور مذہبی اصولوں اور طریقوں میں صحیح کو غلط سے الگ کرنے کا وہ معیار کیا ہے جو انسان کو مطمئن کر سکے اور جس کی روشنی میں فرد اور معاشرہ کی زندگی سکون و راحت سے بھر جائے اور عدل و انصاف پر قائم ہو جائے تو بلاشبہ یہ بڑا کام ہوگا۔ اگر ہم

---

(۱) Peter L.Berger (ed.), Ethics and Public Policy Centre, Washington D.C. 1999

انسانوں کو یہ بتا سکیں کہ ان کا مطلوبہ مذہب اسلام ہی ہے اور انھیں اس کے مطالعہ کے لیے تیار کر سکیں، اور ان معیاروں پر اسے پرکھنے کے لیے آمادہ کر سکیں تو ہم تحریک اسلامی کی ایک غیر معمولی خدمت انجام دیں گے۔ آج اسلام ہی وہ دین ہے جس کی اشاعت کی رفتار مشرق ومغرب میں دوسرے مذاہب کے مقابلے میں تیز تر ہے باوجود یہ کہ اسے وہ وسائل وذرائع حاصل نہیں جو دوسرے مذاہب کو حاصل ہیں اور باوجود یہ کہ آج اسلام اور مسلمان مختلف اطراف سے ہر طرح کے حملوں کا شکار ہیں۔ ہم حق کے متلاشی حضرات کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اسلام کے تصور خدا اور اس کے واحد ہونے کی معقولیت پر غور کریں۔ وہ اس بات پر بھی غور کریں کہ زندگی کے بنیادی مسائل میں انسانی عقل کسی قطعی اور یقینی نتیجہ پر پہنچنے سے قاصر ہے۔ ان مسائل میں خدا کی ہدایت ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ پھر یہ سوچیں کہ اس ہدایت کے ہم تک پہنچنے کی واحد اور قابل وثوق راہ صرف خدا کی وہ وحی ہے جو وہ اپنے پیغمبروں کے ذریعہ مختلف زمانوں اور ملکوں میں بھیجتا رہا ہے، اور یہ کہ اس کی واحد شکل اس کا وہ کلام ہے جو اس نے قرآن کی صورت میں محمد ﷺ پر نازل کیا۔ ہم انھیں اس بات پر بھی غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں کہ خدا کی نازل کردہ کتابوں میں قرآن ہی وہ کتاب ہے جو بعینہ اسی شکل میں موجود ہے۔ جس میں وہ نازل ہوئی اور زمانے کی ہر دست برد سے محفوظ ہے۔ نہ صرف وہ، بلکہ اس کے لانے والے کی سیرت کا ہر باب بھی ویسا ہی محفوظ ہے جیسا کہ اسے ہونا چاہیے اور آخر میں، ہم انھیں اس بات پر بھی غور وفکر کی دعوت دیں کہ اسلام کے پیش نظر کس طرح کے انسان تیار کرنا اور کس طرح کا معاشرہ تشکیل دینا ہے، ہم چاہیں گے کہ وہ اپنے غور وفکر میں اسلام کی اس تصویر کو پیش نظر رکھیں جو قرآن اور اس کے نبی کی سنت سے ابھرتی ہے نہ کہ وہ تصویر جو مسلمانوں اور ان کی حکومتوں اور معاشروں سے سامنے آتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اگر وہ اپنے فکری سفر میں ان باتوں کو ملحوظ رکھیں گے تو ان کو حق تک پہنچنے میں دشواری نہیں ہوگی۔

اپنی بات ختم کرنے سے پہلے میں چند باتیں اور آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔

اول یہ کہ جماعت کے منصوبوں کو پوری طرح روبہ عمل لانے کے لیے جو اقدامات کرنے چاہییں

اس کے لیے ضروری ہے کہ ہماری تحریکی مشینری سبک وفعّال (Efficient) ہو۔اس میں نئی قوتوں اور صلاحیتوں کے افراد داخل ہوں۔ جو افراد عمر کے ایسے مرحلے میں پہنچ گئے ہیں، جن میں قویٰ مضمحل ہونے لگتے ہیں اُن کی جگہ لینے کے لیے نئے افراد تیار ہوں۔

آج دنیا جن حالات سے گزر رہی ہے اور ہمارے ملک میں جو رجحانات ابھر رہے ہیں، وہ نئی سوچ اور نئے اقدامات کے طالب ہیں۔ان میں سے چند کا میں نے ذکر کیا ہے۔ دوسرے اقدامات ہمارے زیرِغور ہیں۔ اس نازک موقعے پر ہم جماعت کے بہی خواہوں سے گزارش کریں گے کہ وہ آگے آئیں اور ہمارے کاموں میں ہمارا ساتھ دیں۔جزوی معاملات میں اختلاف کو نظر انداز کریں اور ہماری خامیوں اور کمزوریوں سے بھی یہ سوچ کر درگزر کریں کہ انسانوں کی کوئی جماعت خامیوں سے پاک نہیں ہوتی۔ ہمارے نیک کاموں اور ملک وملت کے لیے ہمارے پروگراموں میں بھرپور تعاون کریں۔دین کی اقامت کا جو نصب العین ہمارے پیش نظر ہے،وہ ہم نے اپنے رب کی رضا کی خاطر اختیار کیا ہے۔اس نصب العین کے لیے کام کرنا ہم پر ہی نہیں ان پر بھی فرض ہے۔اسی جذبے کے ساتھ انھیں ہمارا ساتھ دینا چاہیے۔دوسری بات میں یہ کہنی چاہتا ہوں کہ ہمارے نوجوان چاہے یہاں ہوں یا باہر، مرد ہوں یا عورتیں۔انھیں حالات کا صحیح شعور ہونا چاہیے اور جماعت کی ضرورتوں کا صحیح ادراک ہونا چاہیے۔انھیں تحریکی جدوجہد میں اپنی ذمہ داریاں سمجھنی چاہییں اور عزم وحوصلہ کے ساتھ انھیں ادا کرنے کے لیے تیار ہونا چاہیے۔

ہمیں مختلف کاموں کے لیے افراد کی ضرورت ہے۔ ہمہ وقتی بھی اور جز وقتی بھی؛ اور ایسے بھی جو پوری زندگی اور ساری توانائی جماعت کے کاموں میں لگا کر اپنے رب کی خوشی حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ ہمارے ایک رفیق نے خط لکھا ہے کہ وہ سال میں ۴۵ دن ان کاموں میں لگانے کے لیے تیار ہیں جو ہم تجویز کریں۔ ہم نے ان کی پیش کش کو خوش آمدید کہا ہے اور کہا ہے کہ ہمیں ان جیسے اور بہتوں کی ضرورت ہے۔

اگر ہمارے رفقا اپنا حوصلہ بلند رکھیں اور اخلاص، قربانی، محنت اور لگن کا ثبوت دیں تو اِن شاء اللہ ہم سب مل کر جماعت کی تاریخ میں ایک نیا باب رقم کرسکیں گے۔ میں اپنی طرف

سے عزم وحوصلہ، اخلاص وایثار اور سعی وجہد اور ہر فرد جماعت کے لیے نصح وخیر خواہی کا یقین دلاتا ہوں اور آپ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ آپ اپنی دعاؤں میں مجھے یاد رکھیں، خاص طور پر قبولیت دعا کے اوقات میں رب العالمین سے میرے لیے صحت وتوانائی، رشد وہدایت اور نصرت و تائید کی دعا فرمائیں۔ میرے لیے بھی دعا کریں اور جماعت کے ذمے داروں اور تحریک کے دوسرے قائدین کے لیے بھی۔ میں اپنی گفتگو رب کریم سے معافی اور درگزر اور تائید ونصرت کی طلب پر ختم کرتا ہوں:

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۥ وَاغْفِرْ لَنَا ۥ وَارْحَمْنَا ۥ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

●